



دورِ حاضر میں مذہبی خدمات انجام دینے والوں کو درپیش معاشی و معاشرتی مسائل (اسباب – محرکات – حل)
**THE SOCIO-ECONOMIC CHALLENGES OF ISLAMIC SERVICEMEN
IN CURRENT ERA (CAUSES – MOTIVES – SOLUTIONS)**

Osama Fakhruddin Shaikh

Lecturer, Islamic Studies, Bahria University of Health Sciences,
Email: shykh.osama92@gmail.com

Hafiz Muaz

Imam and Religious Scholar,
Hyogo Mosque and Jan Academy, Jan Foundation, Hyogo, Japan.
Email: hafizmuaz25@gmail.com

Hina al Kindiya

Independent Researcher, Assistant Editor
Karachi Islamicus
Email: hinaalkindiya@gmail.com

Abstract:

This article discusses the persistent and increasing socio – economic struggles of religious Servicemen within the contemporary Pakistani societies these Servicemen includes fresh graduates of different Islamic Institutions offering only Islamic Studies Specialization Programs, Imams, khatib, Mosque staff and functionaries. It is well believed that these religious figures hold a significant spiritual and communal position in our society but they are facing serious financial and social strain in current Era. This research argues that non practical employment structures, ambiguous social expectations and rapidly changing community dynamics results in ever increasing problems of these people that just not undermine the well-being of the society but also creates Class Conflicts and Religious Extremism, moreover it also affects the

دورِ حاضر میں مذہبی خدمات انجام دینے والوں کو درپیش معاشی و معاشرتی مسائل (اسباب—محرمات—حل)

significance and functionality of religious institution they lead. This research paper Firstly discuss the Financial Instability and lack of opportunities for them in the current extremely competitive and inflationary structure of the society then it moves on to the social and psychological pressure upon these Servicemen including boundless spiritual and social expectations with adequate support from the society. Finally, the study analyses the Causes, Motives and possible Solutions for the long-term sustainability of the religious leadership, then the article concludes by proposing a framework for reforms in the specific Field advocating the establishment of a broader community dialogue on redefining the role and rights of the religious caretakers in this Era.

Keywords: challenges, Islam, servicemen, job, ethics.

معاش اور کسبِ رزق کا مسئلہ کسی بھی شخص کے لیے سب سے زیادہ فکر انگیز معاملہ ہوتا ہے۔ اگر ایک شخص معاشی اعتبار سے کمزور ہو تو وہ چاہے کتنا ہی ذہین و باصلاحیت کیوں نہ ہو، وہ معاشرے میں اپنا اصولی کردار ادا کر ہی نہیں کر سکتا۔ جس کے نتیجے میں بالآخر معاشرے کے اندران افراد کی ذمہ داریوں اور خدمات کے تناظر میں ایک عملی بحران پیدا ہونا شروع ہو جاتا ہے اور اس کے اثرات پھر کسی مخصوص طبقے کے افراد تک محدود نہیں رہتے بلکہ وہ پورے معاشرے کو اپنی لپیٹ میں لے لیتے ہیں۔ چنانچہ یہی کچھ معاملہ وطن عزیز میں مذہبی خدمات سے وابستہ افراد کا ہے۔ اپنے میدانِ عمل کے اعتبار سے دین دار افراد کو ہم دو طبقات میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ ایک تو وہ لوگ ہیں جو دینی مدارس میں تعلیم حاصل کر رہے ہیں اور انہوں نے اپنی زندگیوں کو مکمل طور پر دین کی تعلیم و تبلیغ کے لئے وقف کر دیا ہے۔ یہ افراد عموماً اپنا کل وقت دینی خدمات میں صرف کر دیتے ہیں۔ زیرِ نظر تحقیقی مقالے میں اسی طبقے کو موضوعِ بحث بنایا گیا ہے چنانچہ ایسے افراد کا تعلق درسِ نظامی فضلاء، حفاظ یا قراء کے طبقے سے ہوتا ہے۔ دوسرے وہ لوگ ہیں جو بنیادی طور پر سکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں کے تعلیم یافتہ ہوتے ہیں اور اپنے خاندان، اساتذہ، دوستوں، کسی دینی حلقے یا جماعت کے زیرِ اثر دین کی طرف مائل ہوتے ہیں اور اس پر عمل کرنے اور اس کی خدمت کرنے کو اپنا نصب العین قرار دیتے ہیں۔ یہ افراد عموماً دین کی خدمت کو ایک جزوقتی مشغلے کے طور پر اختیار کرتے ہیں اور اپنی معاش کے لئے کسی کاروبار یا ملازمت پر انحصار کرتے ہیں۔

مدارس کا اعلیٰ دینی تعلیم یافتہ طبقہ:

مدارس کی بالعموم دو اقسام ہیں: ایک تجوید و قرأت اور حفظ کے مدارس اور دوسرے درس نظامی اور اعلیٰ دینی تعلیم کے مدارس۔ پہلی قسم کے مدارس کے فارغ التحصیل قراء اور حفاظ ہوتے ہیں۔ جبکہ دوسری قسم کے فضلاء، علماء و مفتیان کرام ہوتے ہیں۔ قراء اور حفاظ کرام اپنی تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد عموماً یا تو کسی مسجد میں موزن کی خدمات انجام دیتے ہیں اور اس کے علاوہ کسی حفظ یا تجوید کے مدرسے میں بطور معلم خدمات انجام دیتے ہیں۔ آج کل یہ حضرات اپنی آمدنی میں کچھ اضافہ کرنے کے لئے ہوم ٹیوشنز پر بھی انحصار کرتے ہیں۔ اور بعض دیگر "آن لائن قرآن ٹیوٹر" کے طور پر بھی قرآن پڑھاتے ہیں۔ لیکن ایسے افراد کی تعداد بہت ہی کم ہے کیونکہ اس کے لیے سب سے بڑا مسئلہ کمپیوٹر یا سمارٹ فونز کے استعمال سے ناواقفیت ہے۔

اسی طرح ہمارے یہاں اعلیٰ دینی تعلیم کے لئے بے شمار جامعات اور مدارس کا ایک جال پورے ملک میں پھیلا ہوا ہے۔ دوسری قسم کے حضرات عام طور پر انہی مدارس و جامعات میں اپنا روزگار تلاش کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور ساتھ ساتھ کسی مسجد میں امام یا کسی دارالافتاء میں بطور مفتی کام کرنے کو ترجیح دیتے ہیں۔ ان کا مکمل کیریئر بس یہی ہوتا ہے اور وہ اسی سے حاصل ہونے والی قلیل آمدنی سے اپنا گزر بسر کرتے ہیں۔ دینی تعلیم کے کورس کو درس نظامی کہا جاتا ہے۔ یہ اورنگ زیب عالمگیر کے دور کے ایک ماہر تعلیم ملا نظام الدین کا ترتیب دیا ہوا نصاب ہے جو تمام مکاتب فکر کے دینی مدارس میں کچھ کمی بیشی کے ساتھ رائج ہے۔ اس دور میں یہ نصاب حکومت کی سول سروس کے لئے تیار کیا گیا تھا۔ وقت کی ضرورت کے پیش نظر اس میں چند تبدیلیاں بھی کی گئیں۔

ان مدارس کے فارغ التحصیل علماء عموماً مساجد میں امام یا خطیب کی ذمہ داریاں ادا کرتے ہیں۔ ان میں سے جو افراد اچھے مقرر ہوتے ہیں وہ جمعے کی نماز کی خطابت کے علاوہ جلسوں وغیرہ میں تقاریر کر کے بھی کچھ رقم کمالیتے ہیں۔ اس کے علاوہ ان میں سے جو علمی اعتبار سے مستحکم ہوتے ہیں، وہ کسی مدرسے میں بطور معلم ملازمت حاصل کر لیتے ہیں۔ گزشتہ چند دہائیوں سے یہ رجحان بھی دیکھنے کو ملتا ہے کہ مدارس کے بعض فضلاء کرام عصری تعلیمی اداروں میں جہاں کے نصاب میں بھی عربی و اسلامیات پڑھائی جاتی ہے، اس وجہ سے بعض علماء جدید تعلیمی اداروں میں بھی بطور معلم عربی و اسلامیات خدمات انجام دیتے ہیں۔ بعض ایسے حضرات جنہیں مالی امداد کرنے والے دوست اور ساتھی مل جائیں، عموماً اپنا دینی مدرسہ کھول لیتے ہیں۔ آخر الذکر دونوں طبقے دیگر حضرات کی نسبت معاشی اعتبار سے سب سے بہتر حالت میں ہوتے ہیں۔ لیکن فی الجملہ خالصتاً مذہبی خدمات انجام دینے والے حضرات شدید معاشی

دورِ حاضر میں مذہبی خدمات انجام دینے والوں کو درپیش معاشی و معاشرتی مسائل (اسباب—محرمات—حل)

مشکلات کا شکار ہوتے ہیں جس کے نتیجے میں وہ اپنی اصل ذمہ داریاں بھی احسن انداز پر ادا نہیں کر پاتے۔ ان حضرات کو کسبِ معاش کے سلسلے میں جن مسائل کا سامنا کرنا پڑتا ہے اس کا تفصیلی تجزیہ آئندہ سطور میں پیش کیا جاتا ہے۔

۱. بیروزگاری یا ملازمت کے انتہائی محدود مواقع:

وطنِ عزیز پاکستان میں جو طبقہ اپنی زندگی کے قیمتی آٹھ آٹھ، دس دس سال، دینی تعلیم حاصل کرنے کے بعد عملی میدان میں آتا ہے ان کے لیے فراغت کے بعد سب سے کٹھن اور صبر آزما مرحلہ ملازمت کے حصول کا ہوتا ہے۔

یہ حضرات یا تو کسی مسجد میں امامت و خطابت یا پھر کسی مدرسہ میں مدرس کی خدمات انجام دینے کو ترجیح دیتے ہیں۔

اب اگر پاکستان کے صرف ایک مدارس بورڈ "وفاق المدارس العربیہ پاکستان" کے اعداد و شمار کو ہی دیکھ لیا جائے جس کے مطابق سال ۲۰۲۲ء میں اس بورڈ سے ملحق مدارس سے سندِ فراغت پانے والے علماء و عالمات کی کل تعداد ۳۳,۶۶۰ تھی، جبکہ ۱۹۶۰ء سے ۲۰۲۲ء تک کی مجموعی تعداد چار لاکھ، بتیس ہزار اڑسٹھ^۱ بنتی ہے

مزید برآں یہ کہ یہ اعداد و شمار صرف رجسٹرڈ مدارس کے ہیں غیر رجسٹرڈ مدارس کی تعداد اس کے علاوہ ہے، جبکہ سونے پر سہاگہ یہ کہ وطنِ عزیز پاکستان میں ایسے پانچ مختلف مکاتبِ فکر کے الگ الگ تعلیمی بورڈز کام کر رہے ہیں جن کی تعداد بھی اس میں شامل نہیں۔

اب ہر صاحبِ عقل اور معمولی فہم رکھنے والا شخص بھی جانتا ہے کہ جس بڑی تعداد میں مدارس سے فضلاء فارغ ہوتے ہیں نا تو اتنی بڑی تعداد میں مدارس موجود ہیں اور نہ ہی اس کثرت سے مساجد تعمیر ہو رہی ہیں کہ جہاں اتنی بڑی تعداد میں لوگوں کو استعمال کیا جاسکے، اسی طرح دینی طلبہ دینی ریسرچ کا ذوق رکھتے ہیں لیکن وطنِ عزیز میں ایسے ادارے بھی بہت کم ہیں جہاں دین پر ریسرچ کی جاتی ہو تاکہ ان کی صلاحیتیں وہاں استعمال ہوں۔ نتیجتاً باصلاحیت نوجوانوں کا ایک بہت بڑا طبقہ نہایت سنگین قسم کے معاشی بحران کا شکار ہو جاتا ہے۔ جو فی الواقع ایک اہم دینی، معاشرتی اور معاشی مسئلہ ہے۔ جس کا حل کرنا صرف حکومت کا کام ہے بلکہ دینی مدارس و بورڈز کے اربابِ حل و عقد بھی اس کے ذمہ دار ہیں کہ ان مسائل کا قراقری حلی تلاش کیا جائے۔

۲. محدود تنخواہ و آمدنی:

مساجد و مدارس کے ملازمین کو ان کے معاشرتی مقام سے حد درجے ہم تنخواہ و مراعات ملتی ہیں جو کہ اسودہ حالی تو درکنار، ان کی بنیادی ضروریات اور گھریلو اخراجات تک پوری کرنے کے قابل نہیں ہوتی۔ گنتی کے چند بڑے اور معیاری اداروں اور مساجد کو چھوڑ کر جن کا تناسب فی الجملہ شاید پانچ فیصد بھی نہ ہو ملک بھر میں یہی صورت حال ہے۔

اگر کوئی شخص دینی تعلیم کی اعلیٰ ترین سند حاصل کرنے کے بعد حصولِ معاش کی طرف بڑھتا ہے تو اس کے لئے دنیاوی اعتبار سے کوئی خاص کشش موجود نہیں ہے۔ حفظ و قراۃ کے مدارس کے ایک عام معلم کی تنخواہ ڈھائی ہزار سے لے کر چھ ہزار روپے تک ہوتی ہے۔ مساجد کے ائمہ کی تنخواہیں بھی اوسطاً پندرہ سے بیس ہزار کے درمیان ہوتی ہیں جبکہ مساجد کے موزن اور خادم حضرات کو ۸۰۰۰ سے ۱۰۰۰ روپے تک ادا کئے جاتے ہیں۔ بعض علماء جلسوں میں خطابت یا نکاح کے ذریعے تقریباً فی کس ۵۰۰۰ روپے تک وظیفہ حاصل کر پاتے ہیں اور مدارس میں بطور معلم بھی زیادہ سے زیادہ ۱۵۰۰۰ تنخواہ ۱۸۰۰۰ کے درمیان ہی ہوتی ہیں۔ یہ اعداد و شمار بھی بڑے شہروں سے تعلق رکھتے ہیں جہاں عام لوگ مساجد اور مدارس کو اچھی خاصی رقم بطور چندہ ادا کرتے ہیں۔ چھوٹے شہروں اور دیہات میں یہ رقوم اور بھی کم ہو جاتی ہیں۔ اس سے آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ ایک امام مسجد اپنی تمام تر کاوشوں کے بعد بڑی مشکل سے زیادہ سے زیادہ بیس ہزار روپے اور خطیب زیادہ سے زیادہ دس بارہ ہزار روپے کما پاتا ہے۔ جو حضرات اپنے مدرسے قائم کر لیتے ہیں، یا کسی عصری ادارے میں بطور معلم القرآن و مدرسِ دینیات ملازمت اختیار کر لیتے ہیں وہ نسبتاً بہتر حالت میں ہوتے ہیں۔ افراط زر کے ساتھ ساتھ ان ائمہ و خطباء کی تنخواہوں میں بھی کوئی خاص اضافہ نہیں ہوتا۔ گویا جس تنخواہ پر ایک امام یا خطیب اپنی معاشی زندگی کا آغاز کرتا ہے، تقریباً اتنی ہی یا اس سے کچھ زیادہ پر اس کا اختتام ہوتا ہے۔ یہ بھی غنیمت ہے کہ عموماً مساجد کے ساتھ امام و موزن کی رہائش کا انتظام کیا جاتا ہے اور ان کے یوٹیلیٹی بلز وغیرہ ادا کر دیے جاتے ہیں۔ اس کے باوجود اس رقم سے یہ حضرات جس درجے کا معیار زندگی حاصل کر سکتے ہیں، اس کا اندازہ ہر شخص کر سکتا ہے۔

مزید یہ کہ امورِ دینیہ پر جو معاشرے میں ہمارے ہاں تنخواہ کا تصور ہے، اس پر علماء نے سیر حاصل مباحث تحریر کی ہیں۔ لیکن اس معاملے میں ایک بات کو ملحوظ خاطر رکھنا چاہیے، حکیم الامت حضرت تھانویؒ سے منقول ہے کہ جو امور دینیہ پر اجرت ہوتی ہے یہ درحقیقت اس کام کا معاوضہ نہیں ہوتا بلکہ یہ نفقہ ہے۔ جس طرح بیوی اپنے اوقات کو خاوند کے لیے مجبوس کر دیتی ہے تو بیوی کا نفقہ اس کے خاوند کے ذمہ ہے، اور جس طرح انتظامی امور سرانجام دینے

دورِ حاضر میں مذہبی خدمات انجام دینے والوں کو درپیش معاشی و معاشرتی مسائل (اسباب—محرمات—حل)

والا ایک ڈی سی او یا کوئی بھی امور عامہ انجام دینا والا سرکاری افسر ہے چاہے کسی بھی شعبے میں ہے تو ظاہر ہے وہ اپنا ذاتی کام نہیں کر رہا، وہ سارے معاشرے کا انتظامی کام انجام دے رہا ہے، تو اس کی مناسب کفالت بھی معاشرے سے لیے گئے محصولات ٹیکس وغیرہ ہی کے ذریعے کی جاتی ہے۔²

اب اگر اسی پیمانے پر جانچا جائے تو امورِ دینیہ سے متعلق عوامی ضروریات مثلاً: امامت، خطابت، اذان، افتاء وارشاد جیسے امور انجام دینے والا ایک عالم دین بھی ہے، اس امام نے، اس خطیب نے، اس موزن نے، اس مفتی نے، یا وہ جو بھی اس طرح کی خدمت سرانجام دے رہا ہے، اس نے اپنے آپ کو مسلمانوں کے کام کے لیے وقف کر دیا ہے۔ اس لیے اس کا نفقہ مسلمانوں کے ذمے واجب ہے۔ اسی طرح یہ بھی درحقیقت معاوضہ نہیں ہوتا بلکہ نفقہ ہوتا ہے۔ اب آئیے اس طرف کہ نفقہ کا قرآنی اصول کیا ہے، تو قرآن مجید نے اس کو "معروف" کے ساتھ جوڑا ہے اور یہ کہا ہے: "علی المواسع قدرہ وعلی المقتر قدرہ (البقرہ-۲۳۶)، ترجمہ: مالدار پر اس کی طاقت کے مطابق اور تنگدست پر اس کی طاقت کے مطابق (نفقہ) دینا لازم ہے۔" یعنی جس کے ذمہ نفقہ ہے، اس کی اپنی مالی حالت کا اعتبار کیا جائے گا۔ ایک غریب ملک کے اندر یا غریب گاؤں کے اندر یا ایک غریب محلے کے اندر اگر کوئی شخص دینی خدمات انجام دے رہا ہے تو جس طرح کا معیار زندگی ان کا ہے، اسی معیار کی زندگی اس امام کو دینا، عالم کو دینا، یہ اس محلے کی ذمہ داری ہے۔ لیکن ایک عالم یا ایک خطیب یا ایک امام یا ایک استاد کسی اچھے شہر میں، بڑے شہر میں، کھاتے پیتے علاقے میں دینی خدمات سرانجام دے رہا ہے تو جو وہاں کے لوگوں کا معیار زندگی ہے، تو یہ ان لوگوں کا فرض ہے، ان کی ذمہ داری ہے، یہ امام پر احسان نہیں ہے بلکہ ان کی ذمہ داری ہے کہ جو ان کا اپنا معیار زندگی ہے، تقریباً وہی اپنے علاقے میں کام کرنے والے عالم دین کو بھی مہیا کریں۔

۳. ازدواجی زندگی و اہل خانہ سے متعلق مسائل:

مدارس میں اپنی زندگی کے آٹھ، دس سال لگانے کے بعد ایک فارغ التحصیل کو دیگر افکار کے ساتھ ایک فکر اپنا گھر بسانے کی بھی ہوتی ہے، مدارس کے پاکیزہ ماحول میں جیسے کیسے اپنے بشری تقاضوں پر قابو کر کے، خود کو ہمہ تن پڑھائی میں مصروف رکھ کر وقت کو گزار لیا مگر اب عمر کے ساتھ بشری تقاضے بھی بڑھتے جاتے ہیں اور گھر والوں کا اصرار بھی چنانچہ اولاً تو شادی کے لیے من پسند رشتہ کا حصول ہی بہت مشکل مرحلہ ہوتا ہے پھر خوش قسمتی سے اگر کوئی اللہ کا بندہ راضی ہو بھی جائے تو شادی کے اخراجات، نان و نفقہ اور سکلی جو کہ ازدواجی زندگی کی نہایت بنیادی ضروریات میں سے ہیں وہ مہیا کرنے کی

فکر میں مبتلا ہو جاتے ہیں پھر ایک تو ان کی اپنی روزمرہ کی ضرورتیں ہیں، آمدورفت کے اخراجات ہیں پھر اس کی بیوی کی ضرورتیں بھی ہیں، اس کو مناسب رہائش مل جائے، اچھی رہائش مل جائے جو آرام دہ ہو، پرسکون ہو، پر تعیش نہ صحیح، لیکن آرام دہ ہو۔ ظاہر ہے، ہم جانتے ہیں کن چیزوں میں گزارہ ہوتا ہے۔ رہائش بقدر ضرورت، کھانے پینے کا جو نظام ہوتا ہے، وہ بھی گزارے پر ہی چل رہا ہوتا ہے۔

اسی مسئلے کی ضمن میں ایک اور مسئلہ ہوتا ہے خاندانی اور سماجی تعلقات کا، ظاہر ہے کہ ہر آدمی کا خاندان ہے، اس کے روابط ہیں، تعلقات ہیں، اس کو جاننے والے لوگ ہیں، شادی بیاہ وغیرہ کے موقع پر لین دین کا معاملہ کرنا پڑتا ہے۔ انسان کی سماجی زندگی تبھی چلتی ہے۔ لیکن ایک عالم کی جب ہم ضروریات مرتب کر رہے ہوتے ہیں تو شاید اس چیز کو ہم اس کی ضرورتوں میں شامل ہی نہیں سمجھتے اس کے علاوہ بچوں کی کچھ سالانہ ضرورتیں ہوتی ہیں، بچے عید کے موقع پر جو توتوں کا، کپڑوں کا تقاضا کرتے ہیں۔ یہ حضرات جو تنخواہ حاصل کر رہے ہوتے ہیں، اس سے تو مہینہ بھی نہیں گزرتا۔ معاشرہ کبھی ایک عالم کی ضروریات مرتب کرتے ہوئے اس چیز کو مد نظر نہیں رکھتا۔ اس کے بچوں کے صحت و تعلیم کے مسائل ہوتے ہیں، وہ بچوں کو اگر اچھی تعلیم دلانا چاہتا ہے، کسی بھی شعبے میں تعلیم دلانا چاہتا ہے تو اس کے پاس اس کی جیب میں اتنی گنجائش ہونی چاہیے۔ یعنی وہ اگر مدرسے میں ہی اپنے بچوں کو لگا رہا ہے تو وہ جبر نہ ہو بلکہ اس کا اپنا اختیار ہو۔ ہمارے ہاں تو صورت حال یہ ہے کہ چونکہ سکول بھیجنے یا فلاں جگہ بھیجنے کی اس کے اندر سکت نہیں ہے، اس لیے وہ بھی اپنے بچوں کو اسی مدرسے میں پڑھانے پر مجبور ہے۔ جب اس مدرسے سے فارغ ہو جائیں گے تو پھر متمم صاحب کی مرضی کہ وہ اس کو وہاں پر رکھیں یا نہ رکھیں۔ ظاہر ہے کہ گنجائش کی بھی بات ہوگی۔ تو بچوں کی مناسب تعلیم، بیوی اور بچوں کی صحت، بچوں کی پرورش، یہ ساری چیزیں ضروریات ہیں۔ اور اس میں رتی برابر بھی تعیش شامل نہیں یہ محض ضروریات ہیں۔ جن کا پورا کیا جانا ان حضرات کا بنیادی حق ہے۔

۴. اعلیٰ تعلیم کے حصول میں مشکلات:

دینی مدارس کا یہ پہلے سے اعلیٰ تعلیم یافتہ طبقہ جب میدانِ عمل میں آتا ہے تو مختلف قسم کی معاشی پریشانیوں کے ساتھ انہیں ایک اور شدید دھچکا یہ پہنچتا ہے کہ معاشرے میں ان کی اس آٹھ دس سالہ عرق ریزی کے بعد حاصل کی گئی تعلیم کی کوئی حیثیت اور وقعت ہی نہیں، اس کی بنیاد پر نہ کہیں سرکاری ملازمت مل سکتی ہے، اور نہ ہی کسی اور شعبے میں تعلیم جاری رکھی جاسکتی ہے۔ گنتی کے چند عصری ادارے ایسے ہیں جو آٹے میں نمک کے برابر ہیں کہ جہاں دینی مدارس سے تعلیم یافتہ طبقہ بغیر کسی اضافی سند کے اعلیٰ تعلیم حاصل کر سکتا ہیں۔ حکومتی سطح پر اگرچہ ایک بہت احسن اقدام یہ کیا گیا کہ مدارس کے وفاق سے باضابطہ سند فراغت حاصل کرنے والے فضلاء کو "ایم۔ اے عربی و اسلامیات" کے مساوی قرار دیا گیا ہے مگر یہ بھی اپنی جگہ ایک حقیقت

دورِ حاضر میں مذہبی خدمات انجام دینے والوں کو درپیش معاشی و معاشرتی مسائل (اسباب—محرمات—حل)

ہے کہ ہماری جو وفا قوں کی سند ہے، وہ درحقیقت ایم اے نہیں بلکہ مساوی ایم اے ہے اور دونوں میں زمین و آسمان کا فرق ہوتا ہے۔ ایم اے کی سند کے پیچھے کوئی نہ کوئی قانون کھڑا ہوتا ہے، مثال کے طور پر کسی بورڈ نے آپ کو میٹرک یا ایف کی سند دی ہے یا کسی یونیورسٹی نے ایم اے کی ڈگری دی ہے تو وہ بورڈ کسی قانون کے تحت وجود میں آیا ہوتا ہے، وہ یونیورسٹی کسی قانون یا آرڈیننس وغیرہ کے تحت وجود میں آئی ہوتی ہے۔ ہر ادارے کو اسے ایم اے تسلیم کرنا ہی پڑتا ہے۔ باقی آپ کی اپنی صلاحیتوں پر ہے کہ آپ کو کوئی قبول

کرے یا نہ کرے، یہ ان کا اختیار ہے۔ لیکن کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ آپ ایم اے نہیں ہیں، لیکن جب مساوی ایف اے، مساوی ایم اے سند لے کر جائیں گے تو اس میں بہت ساری جگہوں پر صوابدیدی اختیارات آجاتے ہیں۔ ہر ادارے کے اپنے صوابدیدی اختیارات ہیں، قانوناً اس کو بی ایم اے ماننا ضروری نہیں ہوتا۔ چنانچہ بلاخر یہ طبقہ پھر نئے سرے سے ڈگریوں کی دوڑ میں مصروف ہونے پر مجبور ہو جاتا ہے۔

۵. احساسِ محرومی و احساسِ کمتری:

دینی جامعات سے سند فراغت حاصل کرنے کے بعد جب اچانک ایک روز معاشرے کی ضروریات سے نا آشناں ان فضلاء کو اس ظالم سماج کے سمندر میں بغیر کسی ہنر و مہارت کے دھکادے دیا جاتا ہے تو چند روز تو مبارکبادیوں اور نظرانوں و تقریبوں میں گزر جاتے ہیں۔ پھر یہ وقت گزرتے ہی بندہ خود کو ہوا میں معلق محسوس کرتا ہے کہ ایک طرف آٹھ دس سال تک اخراجات کا ایک حصہ برداشت کرنے والا خاندان یہ توقع رکھنے لگ جاتا ہے کہ اب مولانا پر آسمان سے من و سلویٰ کا نزول شروع ہو جانا چاہیے۔ وہ جیب خرچ سے ہاتھ کھینچ لیتے ہیں۔ مدارس میں رہتے ہوئے یہ عادت فطرت ثانیہ بن جاتی ہے کہ معمولات زندگی اور کسب رزق کے لیے محنت مشقت کے باہمی تعلق کے بغیر ہی تینوں وقت عمدہ اور اعزازی کھانے میسر آنے چاہیے۔ ہمیں صرف نماز اور کتاب خوانی کی مصروفیات کے عوض ضروریات زندگی میسر آنی چاہیے لیکن پھر غور کرنے پر معلوم ہوتا ہے کہ ہمیں صرف نماز پڑھنا، وعظ کہنا یا کوئی کتاب پڑھنا آتی ہے۔ جس کی موجودہ معاشرے میں کوئی خاطر خواہ پزیرائی نہیں ہے۔ نتیجتاً یہ طبقہ شدید ذہنی دباؤ کا شکار ہو جاتا ہے، اور دل میں احساسِ محرومی اور احساسِ کمتری کا تخم جڑ پکڑنے لگتا ہے۔

دینی مدارس سے فارغ التحصیل فضلاء کے لیے پچھلی دو مشکلات سے دوچند مشکل کام اس نفسیاتی دباؤ سے نکلنا ہوتا ہے جو انہیں معاشرے کا دشمن بنا کر رکھ دیتی ہیں۔ اس پر مستزاد یہ کہ کچھ نام نہاد پڑھے لکھے غیروں اور کچھ بے حس اینوں کے طعنے ان کی شخصیت پر وہ تباہ کن اثرات مرتب کرتے ہیں کہ جس کے گرداب سے باہر آنا بہت وقت اور محنت طلب امر ہے۔ ایسے حالات میں تو مضبوط سے مضبوط اعصاب کا مالک بھی پاتھ پاؤں چھوڑ دیتا ہے۔ اور بعض

اوقات یہی احساس محرومی اور ظالم سماج کا بغض اور انتقامی جذبات معاشرے میں "شدت پسندی" و "فرقہ واریت" اور "دین فروشی" جیسے عفریت کو جنم دیتے ہیں۔ جس کا خمیازہ پورے معاشرے کو بھگتنا پڑتا ہے۔

خلاصہ کلام یہ کہ اعلیٰ ترین دینی خدمات کے لیے زندگیاں وقف کر دینے والے یہ علماء و فضلاء شدید معاشی و معاشرتی بحران کا شکار ہوتے جا رہے ہیں جس کا ازالہ معاشرے کے تمام افراد و طبقات کی اجتماعی ذمہ داری ہے۔

اسباب۔ محرکات۔ حل

مذکورہ بالا تمام تر خرابیوں اور مسائل کی بنیاد میں اتر کر دیکھا جائے تو ہر مسئلہ کی جڑ میں ایک بنیادی سبب قدر مشترک کے طور پر نکل کر سامنے آتا ہے اور وہ ہے "معاشرے میں دینی اور دنیاوی تعلیم کا جداگانہ تصور" اور اسی نظریہ پر استوار کیے گئے جداگانہ تعلیمی نظام جنہوں نے معاشرے میں اتنی گہری طبقاتی خلاء پیدا کر دی ہے کہ جس کو پاٹنا جوئے شیر لانے کے مترادف ہے۔ مسلمانوں کے ابتدائی ادوار میں تعلیم کا یہ جداگانہ تصور نہیں تھا۔ بلکہ ابتدائی طور پر تمام طلبہ کو یکساں دینی و دنیاوی تعلیم فراہم کی جاتی تھی جس میں دین سے متعلق بنیادی عقائد اور فرض عین کی حد تک مضبوط اساس فراہم کر دی جاتی پھر اس کے بعد جس کارِ جہان جس بھی شعبہ میں تخصص کا ہوتا وہ اس شعبے میں اعلیٰ تعلیم کی طرف رخ کرتا۔

اسی موضوع پر شیخ الاسلام مفتی تقی عثمانی صاحب دامت برکاتہ نے ایک موقع پر سیر حاصل گفتگو کرتے ہوئے اپنے والد ماجد "مفتی اعظم پاکستان مفتی شفیع عثمانی" کے حوالے سے یہ بات ارشاد فرمائی:

حضرت والد ماجدؒ نے تقریباً ۱۹۵۰ء میں ایک موقع پر "پاکستان کے عمومی تعلیمی نظام" پر تبصرہ کرتے ہوئے مجمع عام میں یہ بات فرمائی تھی:

"پاکستان بننے سے پہلے ہندوستان میں تین بڑے نظام تعلیم معروف تھے:

ایک دارالعلوم دیوبند کا نظام تعلیم، دوسرا مسلم یونیورسٹی علیگڑھ کا نظام تعلیم اور تیسرے دارالعلوم ندوۃ العلماء کا نظام تعلیم۔ پاکستان بننے کے بعد درحقیقت نہ ہمیں علیگڑھ کی ضرورت ہے، نہ ندوہ کی ضرورت ہے، نہ دارالعلوم دیوبند کی ضرورت ہے، بلکہ ہمیں ایک تیسرے نظام تعلیم کی ضرورت ہے جو ہمارے اسلاف کی تاریخ سے مربوط چلا آ رہا ہے۔"

بظاہر سننے والوں کو یہ بات بڑی تعجب خیز معلوم ہوتی تھی کہ دارالعلوم دیوبند کا ایک مستند مفتی اعظم اور دارالعلوم دیوبند کا ایک سپوت یہ کہے کہ ہمیں پاکستان میں دیوبند کی ضرورت نہیں ہے، بلکہ ہمیں ایک نئے نظام تعلیم کی ضرورت ہے۔ حضرت والد ماجدؒ نے جو بات فرمائی وہ درحقیقت ایک بہت

دورِ حاضر میں مذہبی خدمات انجام دینے والوں کو درپیش معاشی و معاشرتی مسائل (اسباب—محرمات—حل)

گہری بات ہے اور اُسی کے نہ سمجھنے کے نتیجے میں ہمارے ہاں بڑی عظیم غلط فہمیاں پیدا ہوئیں۔ ہندوستان میں جو تین نظامِ تعلیم جاری تھے، وہ درحقیقت فطری نہیں تھے، بلکہ انگریز کے لائے ہوئے نظام کا ایک نتیجہ اور انگریز کی لائی ہوئی سازشوں کا ایک ردِ عمل تھا، ورنہ اس سے پہلے رائج مسلمانوں کے صدیوں پرانے نظامِ تعلیم پر غور کیا جائے تو اس میں مدرسے اور اسکول کی کوئی تفریق نہیں ملے گی۔ وہاں شروع سے لے کر اور انگریز کے زمانے تک مسلسل یہ صورت حال رہی کہ مدارس یا جامعات میں بیک وقت دونوں تعلیمیں دینی اور عصری دی جاتی تھیں۔

صورت حال یہ تھی کہ شریعت نے جو بات مقرر کی کہ عالم بننا ہر ایک آدمی کے لیے فرضِ عین نہیں، بلکہ فرضِ کفایہ ہے۔ یعنی ضرورت کے مطابق کسی بستی یا کسی ملک میں علماء پیدا ہو جائیں تو باقی سب لوگوں کی طرف سے وہ فرائض ادا ہو جاتا ہے، لیکن دین کی بنیادی معلومات حاصل کرنا فرضِ عین ہے، یہ ہر انسان کے ذمے فرض ہے۔ اُن مدارس کا نظام یہ تھا کہ اُن میں فرضِ عین کی تعلیم بلا امتیاز ہر شخص کو دی جاتی تھی، ہر شخص اُس کو حاصل کرتا تھا، جو مسلمان ہوتا تھا۔ البتہ جس کو علمِ دین میں اختصاص حاصل کرنا ہو، اُس کے لیے الگ مواقع تھے۔ جو کسی عصری علم میں اختصاص حاصل کرنا چاہتا تھا، اُس کے لیے مواقع الگ تھے۔³¹

غرض یہ کہ اس منقسم تعلیمی نظام کی وجہ جو لوگ ان نظاموں سے پڑھ کر معاشرے کا حصہ بنے وہ تقسیم در تقسیم کا شکار ہوتے چلے گئے۔ اور جس کی وجہ سے عصری اداروں کے فارغ التحصیل دین کی بنیادی اور اساسی تعلیمات سے تہی دامن ہوتے گئے جبکہ مذہبی طبقہ مختلف قسم کی معاشی و معاشرتی مشکلات کی دلدل میں پھنستا چلا گیا۔

ذیل کی سطور میں ان مشکلات کے ضمنی اسباب پر سیر حاصل تجزیہ کیا جائے گا۔

۱. معاشرے کی ترجیحات:

تغییراتِ زمانہ کے ساتھ ساتھ معاشرے اپنی ترجیحات طے کرتے رہتے ہیں جو کہ کسی بھی معاشرے کی بقا اور کاروبارِ زندگی کے چلتے رہنے کے لیے نہایت ضروری امر ہے، مگر بعض اوقات یہ ترجیحات کسی بیرونی مؤثر کے زیرِ اثر آجاتے ہیں مثلاً: مفتوح و زوال پزیر معاشرہ، فاتح اور بظاہر ترقی یافتہ نظر آنے والے معاشروں سے متاثر ہو کر اپنی ترجیحات طے کرنے لگتا ہے جس کے نہایت بھیانک اور مہلک نتائج برآمد ہوتے ہیں۔ ایسا ہی کچھ معاملہ انگریز سرکار کے زیرِ تسلط رہنے کی وجہ سے ہمارے ساتھ پیش آیا ہے۔ جب ہم اپنے ارد گرد معاشرے کی ترجیحات کو دیکھتے ہیں تو نظر آتا ہے کہ ہمارے معاشرے کی ترجیحات میں، یا کم سے کم اولین ترجیح دین نہیں ہے۔ چنانچہ معاشرے میں دین کی فروغ و اشاعت اور اس مقصد کے لیے خدمات انجام دینے والے افراد

کی معاشی اعانت و کفالت بھی معاشرے کی ترجیحات میں شامل نہیں۔ نہ من حیث المجموع اور نہ ہی من حیث الافراد معاشرے کی اس طرف توجہ ہے۔ اس کو ایک مثال کے ذریعہ سمجھا جاسکتا ہے مثلاً: معاشرہ اپنی جغرافیائی سرحدوں کی حفاظت کے لیے فوجی جوانوں کی تعلیم و تربیت سے لیکر رہائش، علاج معالجہ، بچوں کی تعلیم یہاں تک کہ ریٹائرمنٹ کے بعد تک کے معاملات کی ذمہ داری اٹھاتا ہے، تو جس طرح ایک نوجوان جب ملک کی جغرافیائی سرحدوں کا محافظ بننے کے لیے اپنی خدمات پیش کرتا ہے تو ساری ریاستی مشینری اس کی ضروریات کو پورا کرنے میں لگ جاتی ہے تاکہ وہ ہر قسم کی معاشی فکروں سے آزاد ہو کر اپنی تمام تر توجہات ملک و ملت کی خدمت میں صرف کر سکے بعینہ اسی طرح یہ علماء و فضلاء کا طبقہ معاشرے کی "نظریاتی سرحدات" کے محافظ و امین ہیں۔ انہوں نے آنے والی وہ نسل تیار کرنی ہے جو معاشرے میں مذہب کی بقا کو دوام بخشنے گی، انہوں نے ہی معاشرے کی تمام تر دینی ضروریات کو پورا کرنا ہے، کہ جس کے بغیر نہ دنیا کی کامیابی ممکن ہے اور نہ ہی آخرت کی۔ لیکن بد قسمتی سے تادم تحریر ریاست پہلی قسم کے افراد کی کفالت کو تو اپنی ذمہ داری سمجھتی ہے جبکہ دوسری قسم کے افراد کو اپنانے سے بھی تذبذب کا شکار نظر آتی ہے حالانکہ اگر "طویل المدتی منصوبہ بندی اور دور رس نتائج" کے تحت بغور جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوتا ہے پہلی قسم کے افراد (یعنی وہ جو ملک و ملت کی حفاظت کے لیے اپنی جان تک قربان کر دینے کے جذبات رکھتے ہوں) کا میسر آنا بھی، دوسری قسم کے افراد کے مرہونِ منت ہے کہ اگر معاشرے میں دینی حمیت اور جذبہ جہاد کی ترغیب دینے والے افراد ہی ناپید ہو جائیں تو ملک و ملت کے نام پر قربان ہونے والے افراد کو کن جذبات کے زیر اثر اس مقصد پر ابھارا جائے گا؟ ظاہر سی بات ہے یہ جذبات، دینی حمیت، غیرتِ ایمانی اور شوقِ شہادت کے زیر اثر ہی پیدا کیے جاسکتے ہیں اور ان سب کا تعلق مذہبی خدمات انجام دینے والے افراد سے ہے۔

بصورت دیگر یہ بات پتھر کی لکیر و نوشتہ دیوار ہے کہ اگر کسی اور جذبہ مثلاً: مال و دولت کی لالچ کے ذریعے کچھ افراد اس مقصد کے لیے تیار ہو بھی جائیں تو وہ کبھی بھی اپنے مطلوبہ نتائج حاصل نہیں کر سکتے۔ جبکہ یہ ویسے ہی اسلام کی روح و اساس کے خلاف ہے۔ لہذا اولاً اس معاملے میں بنیادی کردار معاشرے اور ریاست کا ہے کہ وہ اپنے ان بے لوث دینی خدمتگاروں و خیر خواہوں کی معاشی فارغ بالی میں سنجیدہ اقدامات اٹھائے تاکہ معاشرے کے یہ افراد اپنی پیشہ ورانہ صلاحیتوں کے ساتھ معاشرے میں اپنا حصہ اور مثبت کردار ادا کر سکیں۔

دورِ حاضر میں مذہبی خدمات انجام دینے والوں کو درپیش معاشی و معاشرتی مسائل (اسباب—محرمات—حل)

۲. عدم آگاہی و غیر نصابی صلاحیتوں کا فقدان:

من جملہ دیگر اسباب کے ایک بنیادی سبب و محرک ہمارے معاشرے میں یہ بھی موجود ہے کہ جن لوگوں نے اپنی زندگیاں معاشرے کی دینی ضرورت کو پورا کرنے کے لیے وقف کر دی ہیں ان کی کفالت و ضروریات کی ذمہ داری جیسا کہ پہلے گزر چکا کہ اصلہ تو معاشرے پر ہی عائد ہوتی ہے۔ لیکن بد قسمتی سے معاشرے میں ریاست و منظمہ کی سطح پر تو یہ احساس و شعور بالکل ناپید ہو چکا ہے البتہ عوام الناس میں پھر بھی کسی قدر یہ احساس و شعور زندہ ہے۔ مگر وہ بھی محض ثواب و نیکی کمانے کی حد تک ہے باضابطہ، شعوری طور پر معاشرے میں دینی رجحان کو پروان چڑھانے اور اپنی آئندہ نسلوں تک دین کو باحفاظت پہنچانے کی غرض سے دینی خدمات انجام دینے والوں کی معاشی فارغ بالی کی فکر کرنے والوں کی تعداد آٹے میں نمک کے برابر بھی نہیں۔ مثلاً: آپ کسی سیٹھ صاحب سے رجوع کریں یا کسی تاجر کے پاس جائیں کہ ہمیں اپنے مدارس کے طلبہ میں تقسیم کرنے کے لیے اتنے ہزار قرآنی نسخے درکار ہیں، اس پر اتنی لاگت آرہی ہے۔ وہ اس کو ثواب کا کام سمجھ کر فوری طور پر آپ کو چیک کاٹ کر دے دیں گے۔ لیکن اگر آپ اسی تاجر، اسی صنعت کار سے کہیں کہ: ہم اپنے مدرسین کی معاشی فارغ بالی کے لیے، مالی بہتری کے لیے کوئی پروگرام کرنا چاہتے ہیں اور اس کے لیے اتنے پیسے چاہیے۔ وہ آپ کو نہیں دے گا، کیونکہ وہ یہ سمجھ رہا ہے کہ اُس کام پر تو ثواب ملے گا، لیکن اس کام پر ثواب نہیں ملے گا۔ حالانکہ یہ ثواب ہی نہیں ہے، بلکہ بطور معاشرہ کا ایک فرد ہونے کے یہ اس کی ذمہ داری ہے۔ جیسا کہ شروع میں عرض کیا گیا کہ معاشرے میں بقاء دین کی ہر ممکن کوشش کرنا یہ من حیث المجموع سب مسلمانوں کے ذمہ میں فرض ہے۔ جس نے اپنے آپ کو علم دین کے لیے وقف کیا ہے، اس کے اخراجات کو اٹھانا، یہ ہماری ذمہ داری ہے۔ ہمیں اس فرض کفالیہ کا احساس لوگوں کے اندر پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔ یہ ہماری ایک کوتاہی ہے۔ اس حوالے سے شعور پیدا کرنے کی اور لوگوں کو صحیح صورت حال سے آگاہ کرنے کی ضرورت ہے۔

اب آئیے لکیر کی دوسری جانب یعنی یہ عدم آگاہی و عدم احساس دینی مدارس سے فارغ التحصیل فضلاء کرام میں اور بھی زیادہ سنگین حد تک موجود ہے آٹھ، دس سال تک معاشرے سے کٹے رہنے کی وجہ سے ان میں معاشی معاملات کا شعور سرے سے ہوتا ہی نہیں، اور کسبِ معاش کے لیے صحیح سمت کی طرف راہ نمائی کرنے والے بہت شاذ و نادر ہی کسی کو دستیاب ہوتے ہیں، نتیجتاً اپنے ماحول کا عمومی رجحان اور معاشرے میں اپنے جیسے دیگر افراد کا چلن دیکھ کر خود بھی انہی اصولوں پر اپنے لیے معاش کے حصول کی تدبیر کرنے لگتے ہیں۔ لہذا اس عدم آگاہی و صحیح راہ نمائی کے نہ ہونے کی وجہ سے ایک ہی شعبہ اور فیلڈ کے لیے، ایک ہی جیسی استعداد کے لوگ میسر آنے لگتے ہیں، بالآخر یہ رجحان ایک ہی طرح کے رجال کار کی بہتات پر منتج ہوتا ہے جس کا

لازمی انجام یہ ہوتا ہے کہ معاشرہ ایک بہت بڑی تعداد میں باصلاحیت، باشعور اور بھرپور دینی مہارت رکھنے والے بے شمار معاشرے سے مخلص اور اس کے خیر خواہوں سے استفادہ کرنے سے محروم ہو جاتا ہے، اور استفادہ تو درکنار الٹا ناقدری اور بے اعتنائی کا مرتکب ہوتا ہے۔

اب اگر کسی بھی وجہ سے معاشرہ اپنی ذمہ داری کو احسن انداز پر پورا نہیں کر پارہا تو خود دینی خدمات انجام دینے والے افراد کیا کریں؟ کیا وہ بھی بدلے میں دینی خدمات انجام دینا چھوڑ دیں؟ کیا اتنی بڑی تعداد میں معاشرے کے افراد کو اعلیٰ دینی تعلیم حاصل کرنے سے روک دیں؟ ظاہر ہے یہ کام عملی طور پر ممکن نہیں ہے اور کسی کو دینی تعلیم حاصل کرنے سے کوئی کیوں کر روک سکتا ہے پھر کیا، کیا جائے؟

ہمیں اپنے مدارس کے طلبہ کو بنیاد ہی سے "خود انحصاری" اور "خود داری" کا شعور دینے کی ضرورت ہے۔ دورانِ تعلیم وقتاً فوقتاً ایسی ورک شاپس یا کیریئر کاؤنسلنگ سے متعلق سیمینارز منعقد کروانے چاہیے جو طلبہ میں فراغت کے بعد اپنی معاشی ذمہ داری اٹھانے کے لیے "رخ متعین" کرنے میں مددگار و معاون ثابت ہوں۔ یا کم سے کم اگر مدارس میں یہ سہولت موجود نہ ہو تو طلبہ کو خود اپنے طور پر ایسے آگاہی پروگرامز میں شرکت کرنی چاہیے اور اتنا بھی نہ ہو سکے تو اپنے ارد گرد ایسے علماء جو تعلیم و تدریس یا امامت و خطابت کے ساتھ دیگر معاشی سرگرمیاں بھی جاری رکھے ہوئے ہیں ان سے وقتاً فوقتاً معلومات حاصل کرتے رہنا چاہیے۔ اور دورانِ تعلیم ہی مستقبل کے اندیشوں کے پیش نظر، اپنی فطری صلاحیتوں کا جائزہ لیتے ہوئے اپنے میدانِ عمل کا رخ متعین کرتے رہنا چاہیے یعنی اپنی محنت کے عملی میدان کا رخ متعین کرنا لینا چاہیے اور تکمیل سے پہلے پہلے اس مقصد کے لیے کچھ نہ کچھ عملی اقدام بھی اٹھالینے چاہیے۔

خلاصہ کلام یہ کہ اسناد اور ڈگریوں کی افادیت اپنی جگہ مگر طلبہ کو اپنے طور پر اپنے اندر درسی کتب سے آگے بھی سیکھنی چاہیے۔ جو آگے چل کر معاشرے میں ان کی معاشی بقاء کو Skills بڑھ کر کچھ "ہنر" اور سہارا دے سکے اور دینی خدمات کے ساتھ ساتھ زندگی کی گاڑی چلتی رکھنے میں معاون و مددگار ثابت ہو۔ ان غیر نصابی صلاحیتوں میں آئی۔ ٹی یعنی کمپیوٹر سے متعلق مہارتیں سب سے زیادہ مفید ہیں جس کے ذریعہ ایک فاضل باآسانی کسی بھی شعبے میں آئی۔ ٹی سے متعلق خدمات انجام دے کر روزگار کما سکتا ہے مثلاً:

۱. کمپوزنگ :- اس ہنر کے ذریعے طلبہ کے لیے کتب کی طباعت و اشاعت و تصحیح کا وسیع میدان کھل جاتا ہے۔

۲. ایکسل ایکسپرسٹ :- آج تقریباً ہر شعبے میں ڈیٹا انٹری کے لیے افراد درکار ہوتے ہیں، ہفتہ - ڈیڑھ ماہ میں یہ کام سیکھ کر بہتر معاش کمایا جاسکتا ہے۔

دورِ حاضر میں مذہبی خدمات انجام دینے والوں کو درپیش معاشی و معاشرتی مسائل (اسباب—محرمات—حل)

۳. آن لائن تدریس :- یہ بھی کمپیوٹر سے متعلق ایک شعبہ ہے، جس میں وقت اور خطے کی قیود سے آزاد انسان کسی بھی وقت اپنی پیشہ ورانہ خدمات پیش کر کے مناسب روزگار کما سکتا ہے۔

۴. آن لائن کاروبار :- کووڈ-۱۹ کے بعد سے اس شعبے میں بھی انقلابی ترقی دیکھنے میں آئی ہے فضلاء اپنے فارغ اوقات میں باآسانی اس سے مستفید ہو سکتے ہیں۔

مذکورہ بالا مہارتیں / اسکمز صرف ایک شعبے سے متعلق ہیں، اسی طرح دیکھا جائے تو ہر فاضل اپنی امامت، خطابت و تدریس کے اوقات کے حساب سے بے شمار دیگر ہنر سیکھ کر اپنی معاشی حالت بہتر کر سکتے ہیں۔

خود برصغیر کی عظیم دینی درس گاہ "دارالعلوم دیوبند" میں دینی مہارت کے ساتھ ساتھ مختلف ہنر مثلاً: درزی گری، کتابت و جلد سازی اور فنِ طب اضافی فنون کے طور پر سکھائے جاتے تھے۔ جن میں اول الذکر دونوں فنون کی تعلیم آج تک جاری و ساری ہے دارالعلوم کی ویب سائٹ پر "دارالعلوم دیوبند کے تعلیمی شعبہ جات" کے عنوان کے تحت مندرجہ ذیل تفصیلات کی تصدیق کی جاسکتی ہے:

شعبہ دارالصنائع:

"تعلیم کے ساتھ طلبہ کی معاشی و اقتصادی مسائل کے حل کی جانب پیش رفت کے سلسلے میں ۱۳۶۵ھ / ۱۹۴۵ء میں یہ شعبہ قائم ہوا تھا۔ اس شعبہ میں طلبہ کو خیاطی اور جلد سازی سکھائی جاتی ہے تاکہ طالب علم ضرورت کے وقت کسب معاش سے عاری نہ رہے۔

اس شعبہ میں درزی کا کام سکھایا جاتا ہے۔ جس میں "کرتا پاجامہ اور صدری کی کٹنگ و سلوائی اور شیر وانی کی کٹنگ" ایک سال میں سکھادی جاتی ہے۔ اس شعبہ میں کچھ طلبہ تو باقاعدہ داخلہ لے کر خیاطی سیکھتے ہیں جب کہ دیگر کچھ طلبہ خارج وقت میں اختیاری طور پر اس شعبہ سے مستفید ہوتے ہیں۔ شعبہ تجوید کے طلبہ اختیاری طور پر اس شعبہ سے مستفید ہو سکتے ہیں۔"

اسی طرح جدید عصری تقاضوں کے پیش نظر فراغت کے بعد ایک سالہ "کمپیوٹر ٹریننگ کورس" بھی جاری ہے جس کے تفصیلات درج ذیل ہیں:

"اس شعبہ کا قیام ۱۵/ربیع الاول ۱۴۱۷ھ / جولائی ۱۹۹۶ء کو عمل میں آیا۔ اس شعبہ میں کمپیوٹر کی تربیت دینے کے لیے ہر سال چند منتخب فضلاء کا داخلہ لیا جاتا ہے۔ ایک سال کے عرصہ میں ڈی ٹی پی سے متعلق جملہ امور کی ٹریننگ کے ساتھ انہیں انگلش کی تعلیم بھی دی جاتی ہے۔ سالانہ امتحان میں کامیابی

کے بعد طلبہ کو ڈپلومہ کی سند دی جاتی ہے۔ دارالعلوم کے شعبہ کمپیوٹر کے فارغ طلبہ اس وقت ہندوستان کے بیشتر بڑے مدارس میں کمپیوٹر کی تدریسی و عملی ضرورت پوری کر رہے ہیں اور ملک و بیرون ملک اچھے اداروں میں باعزت ملازمتوں میں لگے ہوئے ہیں۔

"مرکز المعارف ایجوکیشن ریسرچ سینٹر" کے تحت "دو سالہ انگریزی زبان و ادب" کا ایڈوانسڈ ڈپلومہ کورس بھی جاری ہے جس کے تحت مندرجہ ذیل تفصیلات درج ہیں:

"یہ شعبہ ۱۴۲۳ھ / ۲۰۰۲ء میں قائم ہوا ہے۔ اس شعبہ میں دارالعلوم سے فارغ ہونے والے طلبہ کو داخلہ دیا جاتا ہے۔ شعبہ کا نصاب تعلیم دو سال پر مشتمل ہے۔ طلبہ کو انگلش ٹیکسٹ بک، گرامر، اردو و انگریزی ترجمہ اور عربی و انگریزی ترجمہ کے ساتھ انگلش اسپیکنگ اور رائٹنگ پر دھیان دیا جاتا ہے۔ دو سال کی تربیت کے بعد اس شعبہ کے طلبہ بی اے لیول کی انگلش کے ساتھ انگریزی تحریر و تقریر پر اچھی قدرت حاصل کر لیتے ہیں۔ دوران تعلیم طلبہ کی اسلامی وضع قطع کی طرف پورا دھیان دیا جاتا ہے اور طلبہ کی دعوتی و دینی ذہن سازی اور معیاری تعلیم و تربیت پر مکمل توجہ دی جاتی ہے۔"

علاوہ ازیں "اردو صحافت و انشاء" کا ایک سالہ کورس بھی شیخ الہند اکیڈمی کے تحت کئی سالوں سے چل رہا ہے تاکہ فراغت کے بعد گزربسر کے لیے مختلف و متنوع ذرائع معاش سے استفادہ کیا جاسکے۔ چنانچہ پاکستانی مدارس میں بھی اس قسم کے عملی اقدامات ہنگامی بنیادوں پر اٹھانے کی ضرورت ہے تاکہ وطن عزیز میں دینی امور کی انجام دہی میں بے لوث خدمات پیش کرنے والا یہ طبقہ معاشی اور معاشرتی بحرانوں سے نکل کر پوری توجہ اور مکمل دلچسپی کے ساتھ اپنے فرائض انجام دے سکے۔

۳۔ کشادہ ذہنی، مثبت سوچ اور متبادل ذرائع معاش کی حوصلہ افزائی کا فقدان:

علم معاشیات کا ایک اصول ہے جسے اصول "طلب و رسد" بھی کہا جاتا ہے جو کسی حد تک فطری تقاضوں سے بھی کافی ہم آہنگ ہے اور وہ یہ کہ جس چیز کی بھی بہتات ہوگی اس کی قدر و منزلت یا اہمیت کا احساس کم ہوتا چلا جائے گا۔ یہاں بھی یہی اصول بعینہ اسی طرح کارفرما ہے کہ جب کسی ایک شعبے کی ضرورت کے افراد بہت بڑی تعداد میں معاشرے میں آنے لگ جائیں درآں حال کہ ان کی کھپت کے لیے مناسب انتظام یا کوئی اور متبادل شعبہ نہ ہو تو پھر بدیہی سی بات ہے کہ معاشرہ ایسے افراد کو کہاں استعمال کرے اور ان کی پیشہ ورانہ صلاحیتوں کو کیسے بروئے کار لاتے ہوئے تعمیر معاشرہ میں انہیں کارآمد بنایا جائے؟

دورِ حاضر میں مذہبی خدمات انجام دینے والوں کو درپیش معاشی و معاشرتی مسائل (اسباب—محرمات—حل)

اس مسئلہ کی بنیاد و اساس اس مفروضے پر قائم ہے کہ مدارس سے فارغ التحصیل علماء و فضلاء کے شایانِ شان اگر کوئی کام ہے تو وہ صرف اور صرف امامت و خطابت ہے، یا درس و تدریس ہے یا انہی دونوں شعبوں کے گرد گھومتے دیگر مخصوص شعبہ جات ہیں۔ مزید برآں المیہ یہ ہے کہ معاشرے میں بھی اس سوچ کی بھرپور پزیرائی موجود ہے یعنی لکیر کی دوسری جانب بھی اسی سوچ کو حقیقت اور اصل سمجھا جاتا ہے۔ حالانکہ یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ کس طرح انبیاء، صحابہ، قرنِ اول کے چوٹی کے فقہاء، محدثین و صوفیاء یہاں تک کہ ابھی ایک صدی پہلے تک کے اہل علم نے مذکورہ بالا ذرائعِ معاش کے علاوہ بھی بے شمار متبادل ذرائع کسب کو اختیار کیا ہے اور اس میں ان کے لیے کوئی چیز بھی مانع اور باعثِ عار نہیں بنی۔ نا صرف یہ بلکہ ان دیگر ذرائع کو اختیار کرنا بھی ان کے مذہبی فرائض اور دینی خدمات کی انجام دہی میں قطعاً مانع و مغل نہیں رہا۔⁴

خلاصہ کلام یہ کہ ہمیں ابتداء ہی سے اپنے دینی تعلیم حاصل کرنے کے خواہشمند افراد کی "ذہن سازی" کرنے کی ضرورت ہے کہ یہ تعلیم جو ہم حاصل کر رہے ہیں یہ ذریعہ روزگار و معاش ہے ہی نہیں، اسے حاصل کرنے کا بنیادی مقصد تو معاشرے کی دینی ضروریات کو پورا کرنا ہے۔ چنانچہ ہماری سب سے پہلی ترجیح اور اولین ہدف تو یہی ہونا چاہیے اب اگر اس ہدف کے حصول میں ہمیں باآسانی معاشرے میں اس مقصد کے لیے رائج کوئی منصب مثلاً: "امامت و خطابت یا مدارس میں تدریس" یا اسی کے مناسب کوئی جگہ مل جاتی ہے تو فوج و نعت، لیکن اگر ہم کسی بھی وجہ سے مروجہ شعبہ جات میں خدمات انجام دینے سے قاصر رہے تو پھر کیا کریں گے؟

جس طرح معاشرے کو اس معاملہ میں آگاہی فراہم کرنے کی ضرورت ہے۔ اسی طرح ہمیں بطور مذہبی طبقہ اپنا زاویہ نگاہ وسیع کرنے کی ضرورت ہے کہ جب اتنی بڑی تعداد میں فضلاء کو مدارس و مساجد میں استعمال نہیں کیا جاسکتا تو وسعتِ نظری کا مظاہرہ کرتے ہوئے ہمیں اپنے فضلاء کی دیگر ذرائعِ معاش کی طرف جانے کی حوصلہ افزائی کرنی چاہیے اور تصویر کے اس رخ کو بھی دیکھنا چاہیے کہ ایک عالمِ دین جب کسی میدان میں جائے گا تو لازماً وہاں اپنے اثرات ضرور چھوڑے گا اور اس طرح اس میدان میں کام کرنے والی عوام کو بھی اس عالمِ دین کی برکت سے اپنے شعبے کے دینی مسائل اور شرعی باریکیاں سیکھنے کا موقع ملے گا مثلاً: بہت سے فضلاء ایسے ہوتے ہیں جن کے اپنے گھر کے، اپنے آبائی کاروبار ہوتے ہیں۔ وہ کاروبار ایسے ہوتے ہیں جنہیں وہ آسانی سے سیکھ سکتے ہیں، ان کے لیے یہ سیکھنا کوئی مشکل نہیں ہوتا۔ تو ہمیں اس معاملے میں حوصلہ شکنی نہیں کرنی چاہیے۔ عام طور پر یوں ہوتا ہے کہ جو کسی دوسری لائن کی طرف جانے لگے، ہم اس کی حوصلہ شکنی کرتے ہیں۔ لیکن اگر مدرسے کی طرف آئے گا تو مدرسے میں اس کے لیے جگہ نہیں ہے، تو پھر آخر وہ کہاں جائے؟

حکیم الامت حضرت تھانویؒ نے کئی مقامات پر اس مسئلہ پر کلام کیا ہے چنانچہ ایک جگہ آپ سے منقول ہے کہ ضرورت کے وقت اہل علم کے لیے معاش کی ممکنہ آسان صورتیں کیا ہو سکتی ہیں؟

چنانچہ حضرتؒ نے ایک فہرست ارشاد فرمائی جس میں اولاً: "عصری تعلیمی اداروں" میں خدمات انجام دینا ذکر فرمایا۔
ثانیاً: مطب کا شغل رکھنا، ثالثاً: رسالوں و حواشی کی طباعت و اشاعت کا کام، رابعاً: کتابت اور خامساً: کسی مطبع میں بطور مصحح شغل اختیار کرنا بتلایا۔⁵
عصری اداروں (اسکول، کالج) میں بطور مدرس یا لیکچرار خدمات انجام دینا

جیسا کہ ابھی حضرت تھانویؒ کے ملفوظ کے تحت گزرا، فضلاء مدارس کی اضافی تعداد کی کھپت کے لیے سب سے اہم متبادل راستہ ہے، جو ان کی سند کے ساتھ زیادہ مطابقت بھی رکھتا ہے، وہ یہ ہے ان میں جو نسبتاً کم استعداد کے ہوں ان کا رخ عصری تعلیمی اداروں کی طرف موڑ دیا جائے۔ مثلاً سرکاری یا پرائیویٹ عصری اداروں میں ملازمت اس کے لیے ہمیں ابتداء ہی سے اپنے نظام تعلیم میں اس کا اہتمام کرنا چاہیے۔ ہم اس کے اعتبار سے اپنے طلبہ کو ابتداء ہی سے تیار کریں، تاکہ ان کے لیے شروع ہی سے راستے کھل جائیں۔ اس کے لیے ظاہر ہے کہ مدرسے سے باہر ملازمتوں کے لئے سرٹیفکیٹ اور ڈگریاں چلتی ہیں۔ آپ کے پاس میٹرک کی سند ہے یا نہیں، ایف اے ہے یا نہیں، بی اے، ایم اے ہے یا نہیں تو اگر تھوڑی سی محنت کروا کر بے شک مدارس کی چار دیواری کے اندر ہی صحیح یہ عصری اسناد حاصل کر لیں تو اس طرح یہ حضرات بہتر جگہ پر پہنچ کر زبردست دینی خدمات انجام دے سکتے ہیں۔ وہ ایسے کہ دنیا بھر میں ہر علم اور فن کو پڑھانے کے لیے اس کے ماہرین کی خدمات حاصل کی جاتی ہیں اور واضح بات ہے دینی علوم، قرآن، تجوید اور دیگر مذہبی تعلیمات کے لیے مدارس کے فضلاء (جو فی الواقع دینی علوم کے ماہر بھی ہوں) سے زیادہ کون اہل ہو سکتا ہے؟ اور اب تو گھروں میں تربیت نہ ہونے کے برابر ہے چنانچہ ان عملی میدانوں کی طرف بڑھتے نوخیز جوانوں کی دینی معلومات کا واحد ذریعہ یا توانٹرنیٹ ہے یا ان کے وہ اساتذہ جو بہت ہی کم وقت کے لیے اسکولز، کالج و یونیورسٹی میں انہیں دینی مضامین پڑھاتے ہیں۔ اس پر مستزاد یہ کہ:-

۱۔ میڈیا اور انٹرنیٹ کے راستے لامذہبیت، دہریت، الحاد، مغربیت اور مادر پدر آزادی کا ایک ایسا طوفان ہمارے تعلیمی اداروں کے دروازوں پر دستک دے رہا ہے اگر علماء نے ہنگامی بنیادوں پر کوئی اقدامات نہ کیے تو کچھ بعید نہیں کہ مدارس اور اہل مدارس بھی اس طوفان کی زد میں آئے بغیر اور اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکیں گے۔

دورِ حاضر میں مذہبی خدمات انجام دینے والوں کو درپیش معاشی و معاشرتی مسائل (اسباب—محرمات—حل)

۲۔ دینی امور پوچھنے کے لیے علماء و ائمہ مساجد سے رجوع کرنے کا رجحان آہستہ آہستہ بالغان میں ناپید ہوتا جا رہا تو جوانوں کا تو پوچھنا ہی کیا۔ لہذا ایسی صورت حال میں جبکہ علماء کی طرف رجوع کا عوامی رجحان ختم ہوتا جا رہا ہو اور مسلمانوں کے بچوں کی ایک بہت بڑی تعداد مدارس و مکاتب کے بجائے اسکولز، کالج یونیورسٹی میں زیرِ تعلیم ہو تو اس طبقے کی دینی آبیاری اور آگاہی کے لیے مدارس کے صحیح العقیدہ، معتدل المزاج اور راسخ فی العلم علماء و فضلاء کا اس خلاء کو پُر کرنا گزیر ہو جاتا ہے۔

اس کی ایک ممکنہ صورت یہ ہو سکتی ہے کہ مدارس کے اندر ہی جزوقتی طور پر عصری اداروں میں پڑھائے جانے والے چار لازمی مضامین، ا: اردو، ۲: اسلامیات، ۳: انگریزی، ۴: مطالعہ پاکستان میں سے کسی ایک میں ماسٹر لیول تک کے پروگرامز شروع کر کے ان کا الحاق عصری جامعات سے کروا کر باضابطہ امتحانات دلوادیے جائیں، واضح رہے یہ مضامین نہایت زیادہ وقت طلب بھی نہیں اور نہ ہی بہت دقیق ہیں۔ بلکہ درسِ نظامی کے آٹھ سال پر محیط لمبے پروگرام میں محض واجبی سے اوقات ان پر صرف کر کے اہداف حاصل کیے جاسکتے ہیں، اس طرح ایک فاضل جب درسِ نظامی سے فارغ ہوں تو ان کے پاس اضافی طور پر ایک ڈگری بھی موجود ہو جس کی بنیاد پر وہ باآسانی فراغت کے بعد اپنا معاش بھی کماسکے اور نہ صرف معاش بلکہ ان اداروں کے طلبہ کی دینی آبیاری اور نظریہ سازی میں بھی اپنا کردار ادا کریں۔ یاد رکھیں! یہی آج کے عصری طلبہ کل کے سرکاری و غیر سرکاری افسران، پولیس افسران، عدالتوں میں وکلاء و جج صاحبان نیز دیگر محکموں میں جا کر ملک و ملت کی عملی باگ ڈور سنبھالیں گے چنانچہ اگر آج بنیاد ہی سے تعلیمی اداروں میں ان کی درست دینی تربیت کر دی جائے تو چند ہی سالوں میں وطن عزیز کے سرکاری و غیر سرکاری محکموں میں کس قدر بہتری لائی جاسکتی ہے یہ ہر ذی شعور اور صاحبِ فہم شخص باآسانی اندازہ لگا سکتا ہے۔

اس پر مستزاد یہ کہ، مذکورہ چار مضامین تو وطن عزیز میں ہر عصری تعلیمی ادارے میں بطور لازمی مضمون پڑھائے ہی جاتے ہیں ان کے علاوہ بھی بعض مضامین ایسے ہیں جن میں محض مطالعہ درکار ہوتا ہے طلبہ اپنی ذاتی دلچسپی کے پیش نظر ان مضامین کو بھی اختیار کر سکتے ہیں۔ مثلاً: تعلیم، سیاسیات، تعلقات عامہ، بین الاقوامی تعلقات، معاشیات، تاریخ وغیرہ

چنانچہ اس طرح یہی فضلاء انہیں اسناد کی بنیاد پر آگے ایم۔ فل کی صورت میں اعلیٰ تعلیم کی طرف بھی جاسکتے ہیں، کہ جس کے بعد وہ باقاعدہ یونیورسٹیوں میں یہ مضامین پڑھانے کی بھی اہلیت کے حامل ہوں گے۔ جہاں پڑھنے والے، عملی زندگی کے دھانے پر کھڑے طلبہ نسبتاً زیادہ باشعور اور سمجھدار ہوتے ہیں۔

علاوہ ازیں حال ہی میں محکمہ تعلیم نے تمام دو سالہ ڈگری پروگرامز ختم کر کے کالج کی سطح پر چار سالہ گریجویشن پروگرامز شروع کر دیے ہیں۔

کچھ بعید نہیں کہ اگر "دینی جامعات" بھی یہ پروگرامز آفر کر رہی ہوں تو عصری طلبہ کی ایک خاطر خواہ تعداد ان ڈگریوں کے حصول کے لیے ان کا رخ کریں جو کہ ان "دینی جامعات" کے لیے نہایت خوش آئند، یکساں تعلیمی نظام کی طرف کلیدی قدم اور ایک سنگ میل ہوگا۔

نیز اس کے نتیجے میں مدارس کو حاصل ہونے والے معاشی فوائد، فضلاء مدارس کے لیے ذرائع معاش کی اضافی پیداوار کے فوائد اور نئی نسل کی ایک بڑی کھیپ کی نظریاتی آبیاری کے فوائد علیحدہ ہوں گے۔

ہمیں سنجیدہ بنیادوں پر اس معاملے کو دیکھنے کی ضرورت ہے، پیسوں کے لیے نہ سہی اپنی آنے والی نسلوں کے نظریاتی تحفظ کے خاطر اس طرف توجہ دینی چاہیے، اور سب سے بڑھ کر اس کے دور رس نتائج کو سامنے رکھتے ہوئے اپنی حکمت عملی بنانی چاہیے من جملہ ان وجوہات کے ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ہر شعبے اور محکمے میں علماء نہ پہنچ سکتے ہیں نہ ہی ان میں اتنی استعداد ہوتی ہے، لیکن کم سے کم درجے میں اتنا ضرور ممکن ہے کہ جن نوجوانوں نے آج عصری تعلیمی اداروں سے پڑھ کر کل ملک کی باگ ڈور سنبھالنی ہیں وہ علماء اور دین کا درد رکھنے والوں کے تربیت یافتہ ہوں، ان کی بنیاد میں ہی خدا خونی، خدمت خلق اور احساسِ جوابدہی ان کے کردار کا لازمی جزء بنادیا جائے۔ یہ اقدامات اس لیے بھی وقت کا تقاضہ ہیں کہ مسلمانوں کے بچوں کی واضح اکثریت مدارس میں نہیں بلکہ اسکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں میں نشوونما پاتی ہے۔

کیا مسلمانوں کے ان بچوں کی دینی ضروریات پوری کرنا علماء کے منصب کا مقتضی نہیں؟

کیا معاشرے کی نظریاتی سرحدوں کی حفاظت کے لئے ہر شعبے میں "رجالِ کار" فراہم کرنا مدارس کا منشور نہیں؟

جزءِ وقتی یا کل وقتی کاروبار

فضلاء مدارس کے لیے دوسرا بڑا متبادل تجارت ہو سکتا ہے۔ جیسا کہ احادیثِ مبارکہ میں بھی منقول ہے کہ اللہ تعالیٰ نے رزق کے دس میں سے نو حصے تجارت میں رکھے ہیں۔

تسعة أعشار الرزق في التجارة، والعشر في المواشي، یعنی: النتاج^۶

چنانچہ فضلاء کرام کے لیے کسبِ معاش کے لیے دوسرا بڑا متبادل پیشہ تجارت بھی ہو سکتا جو کہ رسالتِ مآب ﷺ، صحابہؓ اور علماء سلف سب ہی کا شیوارہا ہے۔ جو کہ درس و تدریس کے ساتھ باآسانی جاری بھی رکھا جاسکتا ہے۔ چنانچہ ذیل کی سطور میں علماء کے لیے تجارت کی ممکنہ صورتوں پر بات ہوگی۔

دورِ حاضر میں مذہبی خدمات انجام دینے والوں کو درپیش معاشی و معاشرتی مسائل (اسباب—محرمات—حل)

کوئی بھی کاروبار شروع کرنے کے لیے سب سے بنیادی چیز "سرمایہ" کی فراہمی اور دوسری اہم ترین چیز اس کام کا "تجربہ" ہوتا ہے ان دونوں چیزوں کا حصول سب سے زیادہ صبر آزما مرحلہ ہوتا ہے، فضلاء کرام کے لیے بہتر تو یہ ہے کہ درس و تدریس کے ساتھ ساتھ اگر والدین کا کوئی ورثتی پیشہ ہے تو اسی کو اپنائیں جو ان کے آباء و اجداد کرتے چلے آ رہے ہیں۔ ان کے ساتھ شامل ہو جائیں۔ یہ بے حد آسانوں کا موجب ہے۔ اولاً یہ کہ اس میں کوئی سرمایہ لگانے کی ضرورت نہیں، دوم یہ کہ جب ایک عرصے تک اپنے والد، چچا وغیرہ کو کام کرتے دیکھیں گے تو ضرور کچھ سوچ بوجھ حاصل ہو جائے گی سوم یہ کہ جب کوئی سرپرست ہر وقت آپ کی رہنمائی و تعاون کے لئے موجود ہوں گے تو بڑی تیزی سے اعتماد کے ساتھ کاروبار کی اونچ نیچ سے واقفیت ہوتی چلی جائے گی۔ چہارم یہ کہ اس صورت میں دینی خدمات، امامت، درس و تدریس اور تجارت دونوں کو بہت اچھے سے مینیج کیا جاسکتا ہے۔

البتہ اگر کوئی موروثی کام سرے سے ہے ہی نہیں تو چھٹیوں کے اوقات میں کسی دین کار در رکھنے والے مخلص، متدین تاجر کے یہاں پوری توجہ سے وقت دیں اور باریک بینی سے مارکیٹ کی اونچ نیچ کا جائزہ لیں، بس اس میں ایک بات ملحوظ خاطر رکھیں کہ جس چیز سے متعلق آپ دلچسپی رکھتے ہیں، آپ میں اس کام کے کرنے کی جسمانی استعداد اور ذہنی میلان بھی موجود ہے تو اس پیشے کو وقت دے کر سیکھیں۔ اگر آپ اپنی دلچسپی کے مطابق کام کریں گے تو بہت جلد ترقی کرتے چلے جائیں گے۔ تجارت کے میدان میں اپنی صلاحیت جان لینے کے بعد اسی فیلڈ کے کسی تجربہ کار تاجر سے جڑ جائیے جو آپ کے ساتھ مخلص ہو، جو بہترین رہنمائی کرے اور آپ بھی جی جان لگا کر محنت کیجئے

کاروبار کے مالا میں خوب اچھے طریقے سے لین دین کے موتی پرونا سیکھ لیں۔ تاکہ تجربہ اور سرمایہ ہاتھ آتے ہی آپ جلد اپنا کام شروع کر سکیں۔

۱. مارکیٹ سے کم قیمت پر ادھار مال اٹھانا:

ادھار پر مال اٹھا کر مناسب نفع رکھ کر آگے فروخت کرنا بھی سرمایہ بنانے کی ایک بہترین صورت ہے، جس میں کسی قسم کا کوئی سرمایہ بھی درکار نہیں ہوتا۔ مثلاً: مختلف اشیاء کو ہول سیل ریٹ پر ادھار پر خرید کر، کچھ منافع رکھ کر دوکانداروں کو سپلائی کرنا۔

۲. کم سرمایہ کاری والے کاروبار:

فراغت کے بعد سب سے پہلا مسئلہ کسی بھی کاروبار کو شروع کرنے کے لیے سرمایہ کی فراہمی ہوتا ہے، بنیادی طور پر ابتداء میں نہایت کم اور واجبی سے سرمایہ سے ابتداء کیجیے۔ آج کل بہت سے ایسے کاروبار ہیں جو محض پندرہ سے بیس ہزار میں شروع کیے جاسکتے ہیں۔ مثلاً: رمضان المبارک سے دو، چار ماہ قبل کھجوروں پر سرمایہ کاری کر کے سیزن آنے پر مناسب نفع رکھ کر بہترین فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے۔ اسی طرح ابتداء میں مختلف قسم کے سیزنل مصنوعات میں محدود سرمایہ کاری کے ذریعہ بہتر منافع حاصل کیے جاسکتے ہیں۔

۳. قرضِ حسنہ:

جب ایک معتد بہ مدت تک چھوٹے کاروباروں سے آپ تجربہ حاصل کر لیں اور بزنس کی باریکیاں سمجھنے لگیں تو آسان اقساط پر خاطر خواہ سرمایہ بطور قرضِ حسنہ لے کر اللہ کے نام سے اپنا کام شروع کر سکتے ہیں۔

۴. شراکت داری یا پارٹنرشپ:

محدود وسائل اور کم سرمایہ والوں کے لیے تجارت بصورتِ شراکت بھی ایک اچھا آپشن ہو سکتا ہے، بہر حال اس میں اپنے شریک سے حسنِ ظن اور بھرپور اعتماد کلیدی حیثیت رکھتا ہے۔

آنحضرت ﷺ نے بھی شراکت داری پر تجارت فرمائی ہے۔ چنانچہ حضرت سائبؓ بیان فرماتے ہیں کہ میں زمانہ جاہلیت میں رسول اللہ ﷺ کا "شریکِ تجارت" تھا، جب (غلبہ اسلام کے بعد) مدینہ حاضر ہوا تو صحابہ آپ ﷺ کے سامنے میری تعریف کرنے لگے اور مجھے اچھے الفاظ میں ہاد کرنے لگے چنانچہ آپ ﷺ نے فرمایا میں تم سے بہتر اس کو جانتا ہوں۔ میں نے عرض کی: بے شک آپ نے سچ فرمایا میرے ماں باپ آپ پر قربان یا رسول اللہ "اَکنتَ شَرِیکَی فَنِعَمَ الشَّرِیکَ لَاتَدَارِی وَلَا تَمَارِی" 7

آپ میرے شریک تھے اور کیا ہی بہتر شریکِ تجارت تھے، آپ کبھی اپنے وعدے سے نہیں پھرے اور کبھی مجھ سے نہیں جھگڑے "

۵. آن لائن کاروبار:

کووڈ-۱۹ نے جہاں ہر شعبہ ہائے زندگی کو متاثر کیا وہیں اس کے اثرات سے تجارت کی جدید اور متبادل راہیں بھی کھلی انہیں میں سے ایک آن لائن کاروبار کا آپشن بھی ہے، اگرچہ یہ صورت پہلے بھی موجود تھی مگر عموم بلوی کے بعد اس کی طرف تاجروں کا رجحان بہت بڑھ گیا ہے، لہذا فضلاء کرام کسبِ معاش کے لیے اس لائن کا بھی انتخاب کر سکتے ہیں۔ مگر اس میں چند فقہی باتوں کا بطورِ خاص خیال رکھنا ضروری ہے جو مندرجہ ذیل ہیں۔

آن لائن کاروبار میں اگر "بیع" (جو چیز فروخت کی جا رہی ہو) بیچنے والے کی ملکیت میں نہیں ہے اور وہ محض اشتہار، تصویر دکھلا کر کسی کو وہ سامان فروخت کرتا ہو (یعنی سودا کرتے وقت یوں کہے کہ "فلاں چیز میں نے آپ کو اتنے میں بیچی"، وغیرہ) اور بعد میں وہ سامان کسی اور دکان، اسٹور وغیرہ سے خرید کر دیتا ہو تو یہ صورت بائع کی ملکیت میں "بیع" موجود نہ ہونے کی وجہ سے جائز نہیں ہے؛ اس لیے کہ جو چیز فروخت کرنا مقصود ہو وہ بائع کی ملکیت میں ہونا شرعاً ضروری ہوتا ہے۔

اس کے جواز کی صورتیں درج ذیل ہیں:

۱. بائع، مشتری سے یہ کہہ دے کہ یہ سامان میری ملکیت میں نہیں، اگر آپ کو چاہیے تو میں اسے خرید کر آپ کو اتنی قیمت میں فروخت کر سکتا ہوں، یوں بائع اس سامان کو خرید کر اپنے قبضہ میں لے کر باقاعدہ سودا کر کے مشتری کو فروخت کرے تو یہ درست ہے۔

۲۔ آن لائن کام کرنے والا فرد یا کمپنی ایک فرد (مشتری) سے آرڈر لے اور مطلوبہ چیز کسی دوسرے فرد یا کمپنی سے لے کر خریدار تک پہنچائے اور اس عمل کی اجرت مقرر کر کے لے تو یہ بھی جائز ہے۔ یعنی بجائے اشیاء کی خرید و فروخت کے بروکری کی اجرت مقرر کر کے یہ معاملہ کرے۔

۳. اگر بیع بائع کی ملکیت میں موجود ہو اور تصویر دکھلا کر سودا کیا جا رہا ہو تو ایسی صورت میں بھی آن لائن خریداری شرعاً درست ہوگی۔ البتہ جواز کی ہر صورت میں خریدار کو مطلوبہ چیز ملنے کے بعد اختیارِ رؤیت حاصل ہوگا، یعنی جب "بیع" خریدار کو مل جائے تو دیکھنے کے بعد اس کی مطلوبہ شرائط کے مطابق نہ ہونے کی صورت میں اسے واپس کرنے کا اختیار حاصل ہوگا۔

کتابیات

۱. سنن ابوداؤد، لامام ابوداؤد سلیمان ابن الاشعث السجستانی، ط: مکتبۃ البشری، پاکستان، ۲۰۱۷

۲. سنن ترمذی، امام ابو عیسیٰ ترمذی، ط: مکتبۃ البشری - پاکستان، ۲۰۱۷
۳. الجامع الصغیر لامام جلال الدین سیوطی، جلد ۲، رقم: ۳۲۹۶ دار الکتب العلمیہ، بیروت - لبنان
۴. نظام حکومت النبویہ المعروف بالتراتب الاداریۃ لامام عبدالحلیم الکتانی، ط: دار الفکر، ۲۰۱۲
۵. الاستیعاب فی معرفۃ الاصحاب، لفظ عبد البر، ط: دار الجلیل - بیروت - لبنان، ۲۰۰۴
۶. احیاء علوم الدین، امام غزالی، ط: دار ابن حزم بیروت لبنان، ۲۰۰۵
۷. حلیۃ الاولیاء وطبقات الاصفیاء، لابی نعیم، ط: دار الفکر - بیروت - لبنان، ۲۰۱۷
۸. سیر اعلام النبلاء، لفظ شمس الدین الذہبی، ط: مؤسسۃ الرسالہ، ۱۹۸۵
۹. الاعلام بمن فی تاریخ الهند من الاعلام، علامہ عبدالحلیم حسنی، ط: دار ابن حزم بیروت - لبنان، ۱۹۹۹
۱۰. سیرت مصطفیٰ، مولانا دریس کاندھلوی، ط: کتب خانہ مظہری پاکستان، ۲۰۱۶
۱۱. معاش النبوی ﷺ، مولانا یسین مظہر صدیقی، ط: مکتبۃ السیرت، ۲۰۱۵
۱۲. مناقب امام ابو حنیفہ، موفق احمد کی، ط: دار الکتب العربیہ، ۱۹۸۱
۱۳. کتاب الانساب، علامہ عبد الکریم السمعانی، ط: دار الجہان - بیروت - لبنان، ۱۹۸۸
۱۴. المحث علی التجارۃ، امام ابو بکر احمد، ط: عبد الفتاح ابو غدہ، ط: دار البشائر، ۱۹۸۷
۱۵. ملفوظات حکیم الامت، ط: ادارۃ تالیفات اشرفیہ - پاکستان
۱۶. احکام المال، حکیم الامت تھانوی، ت: مولانا محمد زید مظاہری، ط: ادارہ افادات اشرفیہ، لکھنؤ - ہند
۱۷. اصحاب الحرف من الصحاح السنیہ، مولانا عبد اللہ گل، ط: مکتبۃ یوسفیہ - کراچی، ۲۰۱۶
۱۸. ار باب علم و کمال اور پیشہ رزق حلال، مولانا عبد القیوم حقانی، ط: القاسم اکیڈمی، نوشہرہ - ۲۰۰۶

دورِ حاضر میں مذہبی خدمات انجام دینے والوں کو درپیش معاشی و معاشرتی مسائل (اسباب—محركات—حل)

حوالہ جات:

- ¹ ماہ نامہ الوفاق، وفاق المدارس کی درخشندہ روایات کا جاری تسلسل، از مولانا طلحہ رحمانی، فروری ۲۰۲۲
- ² ملفوظات حکیم الامت، ج: ۲۶، ص: ۳۷۵، ط: ادارہ تالیفات اشرفیہ — پاکستان
- ³ جامع اور مؤثر نظامِ تعلیم کی ضرورت، از مفتی تقی عثمانی دامت برکاتہ، ماہ نامہ البلاغ، جمادی الثانیہ/ رجب ۱۴۳۷ھ
- ⁴ کتاب الانساب، امام عبد الکرم السمعانی، ۱/ ۴۰۸، ط: مجلس دائرة المعارف الإسلامية، حیدرآباد — دکن ۱۹۷۷
- ⁵ احکام المال، از حضرت تھانوی، مرتب: مفتی محمد زب ندوی، ادارہ افادات اشرفیہ، لکھنؤ — ہند
- ⁶ أجامع الصغیر لامام جلال الدین سیوطی، جلد ۲، رقم: ۳۲۹۶ دار الکتب العلمیہ، بیروت — لبنان
- ^۷ سنن ابو داؤد، کتاب الادب، باب فی کراہیۃ المراء، رقم: ۴۸۳۶، ط: مکتبۃ البشری، پاکستان ۲۰۱۷